© rasailojaraid.com

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

مولانا عبید اللہ سندھی کا سفرِ ماسکو اور اس کا پس منظر

(پہلی قسط)

۱۹۱۴ء برطانوی حکومت کے لئے سخت آزمائش کا سال تھا اس کی مسلم دشمن پالیسیوں نے اور مصر، ایران، ترکی، افغانستان میں اس کی ریشہ دوانیوں نے جن کا سلسلہ ۱۹۱۱ء سے خاص طور پر شروع ہوا تھا۔ تمام عالم اسلامی کو اس کے خلاف سخت مشتعل کر دیا تھا۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لئے یہ عذاب دوگونہ تھا ایک طرف تو وہ خود غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے دوسری طرف برٹش استعمار کی جو ضرب بھی کسی مسلم ملک پر پڑتی تھی گویا کہ یہ تازیانہ خود ان کی پشت پر تھا۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان ہمیشہ سے اسلام سے شیفتگی اور مسلم ممالک سے ہمدردانہ جذبات کے لئے ایک خاص امتیاز رکھتے آئے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی اور برطانیہ کے لئے مشکلات پیدا ہوئیں تو برصغیر پاک و ہند کے مسلم رہنماؤں نے برٹش حکومت پر ضرب لگانے اور ملک کو آزادی دلانے کا موقع غنیمت جانا چنانچہ مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مسیح الملک حکیم اجمل خان اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی نے افغانستان کی طرف سے برطانوی ہند پر حملہ کرانے کا ایک منصوبہ بنایا۔ اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پہلے مولوی محمد علی قصوری کو حبیبیہ کالج کابل میں بحیثیت پرنسپل مقرر کرایا انھوں کے زمین ہموار کی۔ جب حکومت افغانستان کو برطانوی ہند پر حملے کے لئے آمادہ کرلیا اور حملے سے پہلے برٹش انڈیا کی حریت پسند جماعت اور حکومت افغانستان میں مستقبل کے بارے میں ایک معاہدہ کیے جانے کی ضرورت پیش آئی تو مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کو ۱۹۱۵ء میں افغانستان بھیجا گیا انہوں نے وہاں پہنچ کر حکومت موقتہ قائم کرکے افغانستان سے ایک معاہدہ کرلیا حضرت شیخ الہند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تحریک میں بنیادی اور بہت اہم شخصیت تھے انھیں منصوبے کے مطابق یاغستان جو جنود اللہ (انقلابی افواج) کا ہیڈ کوارٹر تھا پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند یاغستان جانے کے لئے ہندوستان سے نکلے انھیں پہلے حجاز اور پھر وہاں سے ترکی جانے کے راستے یاغستان پہنچنا تھا لیکن وہ ابھی حجاز ہی میں تھے کہ شریف مکہ نے انگریزوں کی امداد اور شہ پر ترکوں سے بغاوت کر کے حجاز پر قبضہ کر لیا اور حضرت شیخ الہند کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے انھیں جزیرہ مالٹا میں لے جا کر قید کر دیا گیا۔

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری سے منصوبہ خاک میں مل گیا لیکن مولانا عبیداللہ سندھی نے حالات و مصالح وقت کے مطابق کام کو جاری رکھا۔ ان کے راستہ میں بہت سی مشکلات تھیں لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری ۱۹۱۹ء کی جنگ جو افغانستان اور برٹش انڈیا کے درمیان میں ہوئی تھیں اور جس کے نتیجے میں افغانستان نے انگریزوں کے تسلط سے نجات حاصل کی تھی اس کے سب سے بڑے منصوبہ بند مولانا سندھی مرحوم تھے اور سرحد سے متعلق ان کے بعض شاگردوں مثلاً ظفر حسن، خوشی محمد وغیرہ کی واقفیت اور رہنمائی سے اس جنگ میں بہت فائدہ اٹھایا گیا تھا۔

لیکن اس جنگ سے توقع کے مطابق برصغیر پاک وہند کی تحریک آزادی کو نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ افغانستان میں رہ کر کام کرنے کی راہیں بھی رفتہ رفتہ مسدود ہو گئیں۔ البتہ انگریزوں کے لئے یہ فائدہ کچھ کم نہ تھا کہ افغانستان کو آزادی دے کر برٹش انڈیا کے خلاف ان تمام ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو گیا۔ جو ہندوستانی انقلاب پسند کابل میں انجام دیتے رہتے تھے ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو منصوری میں افغانستان اور برطانوی حکومت ہند کے مابین ایک مستقل سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ مولانا مرحوم کی سیاسی بصیرت پہلے ہی بھانپ چکی تھی کہ دونوں حکومتوں کے مابین معاہدے کے بعد برصغیر کی آزادی کے لئے انقلابی بنیادوں پر کسی خفیہ طریقے سے کام کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ خود مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ امیر امان اللہ خان نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت موقتہ کا کام کرنے سے روک دیا تھا۔[ص ۴۸] لیکن ان کے لئے یہ بات کچھ کم خوشی کی نہ تھی کہ افغانستان کی آزادی میں ان کی کوششوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔

مولانا مرحوم نے ان حالات کا اندازہ کر کے اپنی تحریک کو آئینی حدود کے اندر رہ کر آگے بڑھانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے انہوں نے کابل میں کانگریس کمیٹی کی شاخ قائم کی اور کانگریس کے عدم تشدد کے فلسفے کے مطابق پر امن طریقے سے سیاسی جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کردیا۔ کانگریس کمیٹی کابل کے صدر مولانا مرحوم خود تھے اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر نور محمد تھے مولانا لکھتے ہیں؛

" حکومت موقتہ کا کام جب اعلیٰ حضرت نے روک دیا تو ہم نے کابل کانگریس کمیٹی بنائی جس کا روح رواں ڈاکٹر نور محمد تھا اس کا الحاق گیا کانگریس میں منظور ہوگیا۔ ڈاکٹر نور محمد ہماری کانگریس کمیٹی کا ممبر تھا جہاتما گاندھی اور کانگریس کے نوجوان ممبر اسے جانتے تھے ہمارے مکرم ڈاکٹر انصاری کانگریس کے سکریٹری تھے اس لئے یہ الحاق کا مسئلہ آسانی سے طے ہوگیا۔ ہماری کانگریس کمیٹی سب سے پہلی کمیٹی تھی جو برٹش ایمپائر سے باہر قائم ہوئی تھی"۔ ص۸

لیکن جب مولانا نے یہ دیکھا کہ وہ آئینی حدود میں رہ کر ہندوستان کی آزادی کے لئے پر امن جدوجہد نہیں کر سکتے اور اس سے انھیں روک دیا گیا تو انہوں نے کابل میں ہندوستانی اردو یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے افغان حکومت سے چارٹر مانگا۔

اس سلسلے میں انہوں نے ایک جامع منصوبہ حکومت کو پیش کیا۔ افغانستان کے وزیر خارجہ سردار محمود بیگ طرزی نے یقین دلایا تھا کہ وہ حکومت سے مولانا کو اردو یونیورسٹی کے قیام کی اجازت لے دے گا۔ مولانا مرحوم کی تحریک پر سپہ سالار جنرل محمد نادرخان نے ملی آباد کی اپنی جاگیر اس کے لئے وقف کردی۔ یہ جاگیر انھیں برطانوی ہند سے جنگ میں کامیابی کے صلے میں ملی تھیں مولانا نے اس جاگیر میں ایک مدرسہ قائم کردیا۔ اس کا صدر مدرس مولانا کا ایک شاگرد عبدالنبی تھا اور انتظام اور مالی امور کی نگرانی کی ذمے داری مولانا کے ایک دوسرے شاگرد ظفر حسن کے سپرد تھیں۔ مولانا مرحوم اس مدرسے کے اخراجات اس جاگیر کی آمدنی اور روسی سفارت خانے کی امداد سے پورا کرتے رہے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد اندازہ ہوگیا کہ حکومت افغانستان کی مجبوریاں ان کے اندازے سے بہت زیادہ ہیں اور اس کے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ انھیں ہندوستانی اردو یونیورسٹی کے قیام کی اجازت دے چنانچہ حکومت نے ہندوستانی اردو یونیورسٹی کا چارٹر دینے سے انکار کردیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔

" ہم نے آخر میں اعلیٰ حضرت سے ہندوستانی تعلیم گاہ کھولنے کی اجازت مانگی لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برٹش سفیر نے افغان وزیر خارجہ کو راضی کر لیا کہ ہمیں ہندوستانی یونیورسٹی کھولنے کے لئے موقع نہیں دیا جائے گا"۔ ص ۹۸

صرف یہی نہیں بلکہ ابتدائی تعلیم کا جو مدرسہ قائم ہو چکا تھا اس میں سازشیں کر کے غیر افغان اساتذہ اور اردو کی تعلیم کے خلاف مقامی طلبہ سے اسٹرائک کروادی اور اسٹرائک کو بہانہ کر کے مدرسہ بند کر ادیا۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی یہاں نہ صرف پر امن سیاسی جدوجہد بلکہ کسی علمی و تعلیمی کام کرنے کا بھی کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے ان حالات میں مولانا مرحوم کے سامنے دو راستے تھے۔

(۱) مولانا تمام سیاسی، علمی و تعلیمی کاموں سے دستبردار ہو کر بیٹھ جائیں۔

(۲) وہ افغانستان سے ہجرت کر کے اور کسی اور ملک میں بیٹھ کر برصغیر کی آزادی کی تحریک چلائیں۔

پہلی معطل زندگی کو گوارا کر لینا ان کی انقلابی طبیعت کے خلاف تھا۔ یہ صورت ان کے لئے موت سے بدتر تھی۔ یہ بات وہ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے۔

دوسری صورت بھی نہایت پریشان اور مایوس کن تھی سوال یہ تھا کہ جائیں تو کہاں جائیں؟ اس قسم کی سیاسی جدوجہد کے لئے سب سے مناسب جگہ پڑوسی ملک ہوتا ہے اور جہاں تک پڑوسی ملک کا تعلق ہے افغانستان تھا وہاں مذکورہ معاہدے نے امکانات کو ختم کر دیا ایران تھا وہاں انگریزوں کا اثر افغانستان سے زیادہ تھا۔ روس تھا وہاں مولانا سندھی مرحوم جیسی دینی شخصیت کے قیام وسکون کی گنجائش بھی نہ تھی۔ صرف ترکی ایک ایسا ملک تھا جہاں بیٹھ کر برصغیر پاک وہند کی آزادی کی تحریک چلائی جا سکتی تھی۔ اگرچہ اس کی سرحد پاک وہند سرحد سے نہ ملتی تھی اور اس درجہ موثر تحریک نہیں چلائی جا سکتی تھی جیسی کہ افغانستان، ایران یا روس میں رہ کر چلائی جا سکتی تھی۔ مولانا سندھی مرحوم ابھی اس سلسلے میں کسی نتیجے پر نہ پہنچے تھے کہ انھیں وزرات خارجہ نے اطلاع دی کہ اب انھیں افغانستان سے چلا جانا چاہیئے اقبال شیدائی صاحب لکھتے ہیں:۔

"انگریزوں کو کابل میں ہماری سرگرمیوں کی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں جن کی وجہ سے انگریزوں کو سخت تشویش تھی چنانچہ انھوں نے امان اللہ خان کو مجبور کیا کہ ان نوجوانوں کو افغانستان سے نکال دیا جائے۔ امان اللہ خان نے پہلے تو انکار کر دیا لیکن بعد میں جب انگریزوں نے بہت زیادہ زور ڈالا تو امان اللہ خان اس پر تیار ہو گئے اور وزارت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خارجہ کو ہدایت کی کہ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کئے جائیں وزارت خارجہ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو بلایا اور کہا کہ اب حالات ایسے پیدا ہوگئے ہیں کہ آپ لوگوں کو افغانستان سے چلے جانا چاہیئے"۔

اب نہ صرف سیاسی بلکہ علمی و تعلیمی کاموں سے دستبردار ہو کر بیٹھ جانے کا امکان بھی ختم ہوگیا اور مولانا کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ افغانستان سے نکل جائیں۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں:۔

"ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا میں بذات خود تھوڑے سے تغیر کے بعد آرام و عزت سے کابل میں رہ سکتا تھا مگر میرے نوجوان رفیقوں جن کی مشقتیں ہماری عزت افزائی کا سبب بنی تھیں انکا مستقبل برباد ہوجاتا۔ اس لئے کابل سے نکلنا ضروری سمجھتا تھا اب ہم اطمینان کے مالک نہیں، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں نے اپنے فائدے کے لئے دوسروں کا نقصان کردیا"

مولانا مرحوم کو افغانستان چھوڑنے کا بہت قلق تھا لیکن اب وہ اس کے لئے قطعی مجبور تھے۔

اب ان کے سفر کی اگلی منزل "ترکی" تھی۔ ایران اس وقت چونکہ انگریزوں کے زیر اثر تھا اس لئے ایران کے راستے انھیں ترکی جانے کی نہ اجازت ملنے کی امید تھی نہ اسے محفوظ راستہ سمجھا جا سکتا تھا۔ اس صورت میں صرف روس ہو کر ہی ترکی پہنچا جا سکتا تھا۔

مولانا سندھی مرحوم نے خوشی محمد کے ذریعے روسی ویزا حاصل کیا خوشی محمد جن کے روسی سفارت خانے سے تعلقات تھے اور اس کے ذریعے مولانا نے مدرسہ کے لئے امداد بھی حاصل کی تھی۔

قافلے کی روانگی کے لئے ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۲ء کا دن طے پایا تھا یہ قافلہ مولانا سندھی مرحوم کی قیادت میں کل دس افراد پر مشتمل تھا مولانا مرحوم کے علاوہ دیگر نو افراد یہ تھے۔

(۱) اقبال شیدائی: سیال کوٹ کے رہنے والے ایک پر جوش نوجوان تھے ۱۹۱۴ء میں جب وہ ایف اے کے طالب علم تھے، سیاسی تحریکات سے متاثر ہوئے اور بہت جلد اپنے جذبہ و جوش عمل سے مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ سیاسی رہنماؤں کا اعتماد حاصل کرلیا۔ ساتھ ہی برٹش امپائر کے سخت دشمن کی حیثیت سے حکومت کی نظروں میں آگئے مدت تک نظر بند رہے ۱۹۱۷ء میں انھوں نے سخت مشکلات اور ہمت شکن حالات میں مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے پاس کیا ۱۹۲۰ء میں جب علمانے ہندوستان سے ہجرت کا فتویٰ دیا اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے نتیجے میں تباہ کن صورت حال پیدا ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں پنجاب و سندھ میں لوگوں کو ہجرت سے باز رکھنے کے اہم کام پر لگایا اسی سلسلے میں وہ افغانستان گئے تھے۔ برصغیر کے مہاجروں کی ناگفتہ بہ حالت نے برصغیر کے مسلمان رہنماؤں کو مطلع کیا اور مسلمانوں کو ہجرت سے باز رکھنے میں بہترین خدمات انجام دیں۔ لیکن ہندوستان میں چونکہ ان کی گرفتاری کے احکام جاری ہو چکے تھے۔ اس لئے خود انھیں افغانستان میں ٹھہرنا پڑا روس کو روانہ ہونے سے پہلے تک وہ کابل میں جمال پاشا کے شعبہ نشر و اشاعت کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔

(۲) عبدالرشید: اندرون موچی دروازہ لاہور کے رہنے والے تھے ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے اور ظفر حسن کے ساتھیوں میں سے تھے انھیں کے ساتھ ہجرت کی۔ کابل میں اقبال شیدائی صاحب کے ساتھ جمال پاشا کے دفتر میں شعبۂ نشر و اشاعت سے وابستہ تھے۔ اقبال شیدائی نے ان کا اصل نام محمد امین لکھا ہے۔ تحریک شیخ الہند میں ان کے بارے میں سی۔ آئی۔ اے کا جو نوٹ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد حافظ عبداللطیف وکیل تھے اور پشاور میں پریکٹس کرتے تھے اور عبدالرشید جنود ربانیہ میں کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔

(۳) خوشی محمد: یہ بھی ظفر حسن کے دوستوں میں سے تھے ۱۹۱۵ء میں ہجرت کی تو کنگ ایڈورڈ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ انقلابی اور پرجوش نوجوان تھے ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں جن طلبہ نے آگ لگائی تھی اس کے لیڈر یہی تھے کابل میں ان کا نام احمد حسن تھا اور روس میں محمد علی کے نام سے مشہور تھے۔ حکومت موقتہ ہند کا جو وفد روس گیا تھا مولانا سندھی نے انہیں بھی اس میں شامل کر دیا تھا کیونسٹ لٹریچر کے مطالعے کے بعد یہ کیونزم سے متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کی ساری وفاداریاں روسی کیونسٹ پارٹی کے لئے وقف ہوگئیں۔ اگرچہ برصغیر کی تحریک آزادی میں بھی دلچسپی لیتے رہے ۱۹۱۹ء میں افغانستان اور برٹش حکومت ہند کے مابین جنگ ہوئی تو انھیں صالح محمد خان کمانڈر انچیف محاذ سمت مشرقی کے ساتھ بطور مشیر مقرر کیا۔ مولانا سندھی مرحوم کا مشورہ ان سب پر فائق تھا۔ حکم تھا کہ مولانا کے مشورے کے بغیر کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

(۴) ڈاکٹر نور محمد: ان کا وطن حیدرآباد سندھ تھا۔ بمبئی یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ سماجی کاموں سے بچپن سے دلچسپی تھی حیدرآباد میونسپلٹی کے چیرمین رہے تھے اور سندھ کانگریس کمیٹی کے سکریٹری بھی رہے تھے یہ ایک نو مسلم اور سرگرم سیاسی کارکن تھے شیخ عبدالرحیم سندھی کی تبلیغ سے انھوں نے اور ان کی والدہ نے اسلام قبول کر لیا تھا بعد میں شیخ صاحب مرحوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے ان کی نومسلم والدہ سے نکاح کر لیا تھا۔ ڈاکٹر نور محمد ۱۹۱۹ء میں ہجرت کر کے کابل پہنچے تھے اور ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ نہایت مخلص، ایثار پیشہ، خادم خلق نوجوان تھے اور ہندوستانی مہاجرین اور مقامی لوگوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ سپہ سالار جنرل محمد نادر خان اور سردار محمود بیگ طرزی کے خاندانوں میں ان کا بڑا رسوخ اور عزت تھی افغان حکومت نے انھیں اعزازی بریگیڈیر کا عہدہ دیا تھا

(۵) **عزیز احمد:** یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے مشہور شاگرد عالم دین اور مفسر مولانا احمد علی لاہوری بانی انجمن خدام الدین لاہور کے چھوٹے بھائی ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ نے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے ساتھ عقد ثانی کر لیا تھا۔ مولانا سندھی عزیز احمد صاحب کو ان کی سعادت مندی اور اطاعت شعاری کی بنا پر مثل اپنی اولاد کے چاہتے تھے اور ان کی ذرا سی تکلیف سے پریشان ہو جاتے تھے۔

مارچ ۱۹۱۵ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان اور حضرت شیخ الہند کے مشورے سے مولوی محمد علی قصوری کابل گئے تاکہ وہ مولانا عبیداللہ سندھی کے لئے میدان ہموار کریں تو مولانا سندھی مرحوم نے انھیں (عزیز احمد) کو ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ مولانا سندھی سے تقریباً آٹھ مہینے پہلے کابل پہنچ کر حبیبیہ کالج میں جس کے پرنسپل مولانا محمد علی قصوری تھے، داخل ہو گئے تھے اور شروع ۱۹۱۶ء تک جب تک مولوی محمد علی کا حبیبیہ کالج سے تعلق رہا یہ بھی اس میں پڑھتے رہے۔ اس کے علاوہ ان کا سب سے بڑا مشغلہ مولانا سندھی مرحوم کی خدمت گذاری تھا اور یہ سعادت انھیں کابل کے بعد سفر روس قیام ماسکو، قیام ترکی اور قیام حجاز کے زمانے میں بھی حاصل رہی تقریباً ۲۵ سال کی مولانا سندھی کی صحبت روز و شب نے فکر عبیداللہی کا آشنا اور ان کی تحریک کے مراتب و خفایا سے واقف بنا دیا ہے۔ ان کا ذہن ہی انقلابی فکری سانچے میں نہیں ڈھل گیا ہے بلکہ وہ خود بھی پیکر انقلاب بن گئے ہیں۔

مولانا سندھی مرحوم تقریباً ۲۴ سال کی جلا وطنی کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء میں وطن مالوف سندھ تشریف لائے تھے لیکن مولوی عزیز احمد صاحب تقریباً ۲۶ سال وطن عزیز سے باہر رہے یعنی انھوں نے مولانا سندھی مرحوم سے تقریباً ۸ ماہ قبل وطن چھوڑا تھا اور مولانا کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۴۰ء میں وطن واپس آئے۔

مولانا سندھی مرحوم کے ساتھ مولوی عزیز احمد صاحب کا ماسکو کا یہ دوسرا سفر تھا پہلا سفر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہوں نے ۱۹۱۹ء میں غلام بچہ محمد ولی خان کی سربراہی میں افغان وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے کیا تھا یہ وفد روسی حکومت سے افغانستان کے سیاسی تعلقات کے قیام واستحکام کے لئے امیر امان اللہ خان نے بھیجا تھا۔ عزیز صاحب اس موقع پر تاشقند میں محنت کشوں کی ایشیائی یونیورسٹی میں تقریباً چھ مہینے روسی زبان اور فنون حرب سیکھتے رہے تھے اور کچھ عرصہ ماسکو میں بھی قیام کیا تھا۔ چند سال ہوئے انتقال ہو گیا۔

(۶) ظفر حسن: یہ صاحب کرنال کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے والد حافظ عظیم الدین دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے۔ انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا تھا۔ بی اے (فائنل) کے امتحان میں صرف ایک مہینہ باقی رہ گیا تھا کہ کالج کے چند ساتھیوں کے ساتھ ۵ فروری ۱۹۱۵ء کو افغانستان کو ہجرت کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے ان کا اور ان کے دوستوں کا ارادہ تھا کہ وہ ترکی جاکر وہاں کی فوج میں شامل ہو جائیں گے اور خلافت اسلامیہ ترکی کی خدمت کے ساتھ برصغیر پاک وہند کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں حصہ لیں گے لیکن انھیں اور ان کے تمام ساتھیوں کو افغانستان پہنچتے ہی نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ دنوں جلال آباد میں نظر بند رہے۔ پھر انھیں کابل روانہ کر دیا گیا۔ مولانا سندھی مرحوم کے کابل پہنچنے کے بعد انھیں نظر بندی سے رہائی مل گئی تھی۔ حکومت موقتہ ہند میں مولانا سندھی مرحوم وزیر داخلہ تھے اور ظفر حسن وزارت داخلہ کے سکریٹری تھے ۱۹۱۹ء سپہ سالار سردار محمد نادر خان وزیر جنگ کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہو گئے تھے سپہ سالار مرحوم ان پر بہت اعتماد کرتے تھے افغانستان اور برٹش انڈیا کے مابین جنگ میں وہ سمت جنوبی کے کمانڈر سردار محمد نادر خان کے ساتھ تھے اور مرحوم سردار ان سے نہایت اہم معاملات میں مشورہ کرتے تھے اور بعض نہایت اہم امور کی انجام دہی پر انہیں متعدد بار مامور کیا تھا۔ انھوں نے جنگ افغان برٹش انڈیا میں بہترین اور نہایت جانبازی کے ساتھ خدمات انجام دیں، جن کا اعتراف سردار مرحوم نے کیا اور امیر امان اللہ خان سے ان کی خدمات کا نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کر کے ان کا تعارف کرایا۔ مولانا سندھی مرحوم کے یہ نہایت اطاعت شعار شاگرد تھے مولانا سے انھوں نے قرآن حکیم کی تفسیر پڑھی تھی۔ افغانستان کی وزارت جنگ میں وزیر جنگ سپہ سالار سردار محمد نادر خان کے پرائیویٹ سکریٹری تھے اور انگریزی اردو اخبارات کا ترجمہ اور ملٹری انٹیلی جنس کا کام کرتے تھے۔ افغان حکومت نے انھیں اعزازی کرنل کا عہدہ دیا تھا۔

(۷) شبنا بنرجی: ۱۹۲۲ء میں جب امیر امان اللہ خان نے قوم میں تعلیم کے فروغ پر توجہ دی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برصغیر پاک وہند سے استادوں کو منگوایا تو ان میں بنگال کے یہ ہندو استاد بھی تھے۔ یہ حبیبیہ کالج میں ریاضی کے معلم کی حیثیت سے مقرر ہوئے تھے۔ سیاست سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی کالج میں تعطیلات کی وجہ سے شوق سیاحت میں یہ بھی قافلے کے ساتھ ہو لئے تھے۔

(۸) **عمر ظفر مسعود**: مسعود صاحب اقبال شیدائی کے خاص دوستوں میں سے تھے اور غالباً انہیں کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں ہجرت کرکے کابل پہنچے تھے اقبال شیدائی نے انھیں اپنے ساتھ جمال پاشا کے دفتر کے شعبہ نشر و اشاعت میں ملازم رکھ لیا تھا۔

(۹) **عبدالعزیز**: عبدالعزیز کے بارے میں اس سے زیادہ حالات کا علم نہیں ہو سکا کہ گجرات کے رہنے والے تھے ۱۹۲۰ء میں لاہور سے ہجرت کرکے کابل پہنچے تھے۔

انقلاب پسندوں کے اس قافلے کے ارکان میں سے میرے علم کے مطابق پانچ حضرات اس وقت بھی بقید حیات ہیں۔ ظفر حسن صاحب ترکی میں مقیم ہیں اقبال شیدائی صاحب راولپنڈی میں سکونت پذیر ہیں۔ عزیز احمد صاحب کراچی میں اقامت گزیں ہیں، عبدالرشید صاحب[۱] لاہور میں اور عبدالعزیز صاحب کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی حیات ہیں اور پنجاب کے کسی شہر میں رہائش پذیر ہیں[۲]

اس قافلے کے تمام افراد کو افغانستان چھوڑنے کا حکم نہ دیا گیا تھا بلکہ بعض افراد کو تو حکومت روکنا چاہتی تھی یا بعض افراد کے لئے حکومت کے بعض ذمے دار افراد ضمانت دینے کے لئے تیار تھے انھیں حکومت نہ صرف یہ کہ خطرناک نہیں سمجھتی تھی بلکہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی مثلاً ڈاکٹر نور محمد اور ظفر حسن کو حکومت روکنا چاہتی تھی یا اقبال شیدائی صاحب کے ترک دوستوں میں سے بدرالدین بے اور فخری پاشا ان کی ضمانت دینے اور امان اللہ خان سے کہہ کر انھیں روک سکتے تھے اسی طرح عبدالرشید اور عمر ظفر مسعود اور عبدالعزیز کی بھی کوئی خاص اہمیت نہ تھی اگر کوشش کی جاتی تو حکومت انھیں بھی کابل میں قیام کرنے کی اجازت دے دیتی۔ شبنا تھ بنرجی تو شوق سیاحت کی وجہ سے ساتھ ہو لئے تھے۔

---

[۱] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو میاں میر چھاونی کے کسی اسکول میں مدرس تھے۔

[۲] یہ مضمون کئی سال سے لکھا ہوا رکھا تھا۔ اب جب کہ یہ اشاعت کے لئے دیا جا رہا ہے اقبال شیدائی اور عزیز احمد اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن تین افراد ایسے تھے جن کا وجود افغانستان کی حکومت کسی قیمت پر بھی ملک میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھی لے

۱۔۔۔ مولانا عبیداللہ سندھی کہ انقلاب پسندوں کے روح و رواح اور رہنما تھے۔

۲۔۔۔ خوشی محمد کمیونسٹ ہونے اور روسی سفیر مقیم کابل سے ربط و ضبط رکھنے کی وجہ سے ناپسندیدہ شخصیت تھا اگر اسے مولانا سندھی کی حمایت اور ضمانت حاصل نہ ہوتی تو وہ پہلے ہی ملک بدر کر دیا جاتا یا اسے جیل میں ڈال دیا جاتا۔

۳۔۔۔ عزیز احمد مولانا سندھی کا عزیز خاص خادم اور ایک پرجوش انقلابی ہونے کی وجہ سے ناقابل برداشت تھا۔

لیکن اس صورت میں کہ مولانا مرحوم کو کابل میں ٹھہرنے اور سیاسی کام کرنے کی اجازت نہ تھی تمام حضرات نے کابل میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر نور محمد اور ظفر حسن نے حکومت کی خواہش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ:

"جب ہمارے بزرگوں کو افغانستان میں سیاسی کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تو ہم یہاں رہ کر افغانی گورنمنٹ کی ملازمت کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ہم افغانستان میں تنخواہ لینے اور پیسے کمانے نہیں آئے۔ ہم صرف اپنے ملک کی آزادی کے لئے کام کرنے کو یہاں آئے تھے۔"

اقبال شیدائی صاحب نے یہ کہہ کر بدرالدین بے اور فخری پاشا کو لاجواب کر دیا۔

"میں کابل میں بے عزت ہو کر رہنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے دوستوں کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑں گا۔"

اس قافلے میں مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے بھتیجے عزیز احمد کے سوا ہر کسی کے پاس چھوٹی موٹی رقم

لے حالانکہ خود سندھی مرحوم کا خیال تھا کہ اگر وہ چاہتے تو تھوڑے سے تغیر کے بعد کابل میں رہ سکتے تھے (کابل میں سات سال ص ۹۸) لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں تھا۔ برٹش حکومت کبھی یقین کر ہی نہ سکتی تھی کہ مولانا سندھی مرحوم کسی شرط کو مان کر بھی ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد سے بے تعلق رہ سکیں گے۔ ایسی صورت میں ممکن نہ تھا کہ مولانا اپنے پروگرام میں تھوڑے سے تغیر کے بعد کابل میں ٹھہر سکتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی۔ مولانا سندھی اور عزیز احمد کابل میں کوئی ایسی مصروفیت نہ رکھتے تھے جس سے ان کی آمدنی ہوتی اس لئے یہ دنوں تہی دست تھے۔

ظفرحسن نے زادِ راہ کی فراہمی کے لئے اپنا گھوڑا اور گھر کا سامان فروخت کر دیا کچھ تنخواہ میں سے بچی ہوئی پونجی تھی۔ اس طرح ان کے پاس ۵۲ پونڈ تھے۔ خوشی محمد نے روسی سفارت خانے سے رقم حاصل کر لی تھی۔ ڈاکٹر نور محمد کے پاس پریکٹس سے پس انداز کی ہوئی رقم تھی۔ اقبال شیدائی کی ان میں سب سے اچھی حالت تھی انھیں جمال پاشا کے دفتر سے بہت معقول تنخواہ ملتی تھی اس سے بچایا ہوا روپیہ ان کے پاس تھا عبدالرشید کے پاس بھی زادِ راہ کے لئے تنخواہ میں سے بچایا ہوا روپیہ تھا۔ عمر ظفر مسعود کے پاس معمولی رقم تھی لیکن ان کے اخراجات کی ذمے داری اقبال شیدائی صاحب نے لے لی تھی۔ عبدالعزیز کے اخراجات کی ذمے داری خوشی محمد نے لے لی تھی برجی نے اسی صورت میں سیاحت کا ارادہ کیا تھا کہ ان کے پاس اخراجات سفر کے لئے مناسب رقم تھی۔

ہندوستانی انقلاب پسندوں کا یہ قافلہ ۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو بروز اتوار علی الصباح کابل سے روانہ ہؤا۔ جبل السراج سفر کی پہلی منزل تھی یہ سمت مشرقی کا مرکزی شہر تھا اس ضلع کا کمشنر احمد علی خان ڈاکٹر نور محمد اور ظفر حسن کا دوست تھا لیکن انہوں نے اسے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی۔ یہاں رات بسر کی۔ یہاں سے ایک راستہ جسے شاہراہ کہنا چاہیئے جو شہر بامیان سے گذرتا ہؤا افغانی ترکستان کے مرکزی شہر مزار شریف کو جاتا ہے یہ راستہ قطغن بدخشان کے صوبے کے قریب سے گذرتا تھا۔

دوسرا راستہ سمت شمالی سے گذرتا تھا یہ ایک نہایت دشوار گزار اور پرخطر راستہ تھا۔ اس راستہ سے کسی ایسے قافلے کا گذرنا سخت مشکل اور خطرناک تھا جس میں گھوڑے اور باربرداری کے خچر وغیرہ ہوں۔ اس راستے سے صرف پیدل چلنے والے اکا دکا مسافر کوہ ہندوکش سے گذر کر افغانی ترکستان جایا کرتے تھے۔

۱۲ اکتوبر کی صبح کو قافلے نے پھر اپنا سفر شروع اور بامیان کے راستے پر روانہ ہوا لیکن ابھی سفر کو دو ڈھائی گھنٹے گذرے تھے کہ پیچھے سے چند افغان فوجی سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور کہا کہ جبل السراج کے حاکم نے آپ کو واپس ہونے کا حکم دیا ہے۔ اس اچانک واپسی کے حکم پر ارکان قافلہ کے دلوں میں طرح طرح شکوک پیدا ہوئے۔ خوشی محمد کی حالت اس حکم سے بہت زیادہ خراب ہوگئی اقبال شیدائی صاحب لکھتے ہیں:-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"محمد علی (یعنی خوشی محمد) جتنے ذہین تھے اتنے ہی بزدل بھی تھے۔ وہ اس اچانک طلبی پر سخت گھبرا گئے راستے میں ہر چند منٹ کے بعد کہتے کہ شیدائی! افغان ہمیں قتل کر دیں گے۔ میں انھیں ہر چند تسلی دیتا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا اور اگر ہوا تو ہم سب کا انجام ایک ہی ہوگا۔ اس لئے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ آخر ایک روز مرنا ہی ہے مگر انھیں چین نہیں آتا تھا اور موت کے خوف سے بار بار ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے اس طرح ہم افتاں و خیزاں جبل السراج پہنچے"۔

جبل السراج واپس پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ ضلع کمشنر احمد علی خان بہت خاطر تواضع کے ساتھ پیش آیا لیکن اس نے قافلے کے کھانے کا انتظام ایک ایسے مکان میں کیا جو ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا اور چونکہ قافلے کے ملازمین اور سائیسوں کو پہاڑی کے نیچے چھوڑ دیا گیا تھا۔ نیز دسترخوان پر جو لوگ تواضع کے لئے موجود تھے وہ پوری طرح مسلح تھے۔ اس لئے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہو رہے تھے ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس سے ہمیں شبہ ہوا کہ ہمارے قتل کی سازش ہے جس کے لئے ایسی جگہ چنی گئی ہے جہاں اگر ہم پر حملہ ہو تو نہ کوئی ہماری مدد کو آسکے اور نہ ہی کوئی آہ و فغاں سن سکے۔ اس قسم کے احتمال کو مدنظر رکھ کر ڈاکٹر نور محمد، خوشی محمد اور میں نے باہم مشورے کے بعد صاحب خانہ کی نظر سے پوشیدہ رہ کر اپنے پستول بھرنے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے ہم یکے بعد دیگرے رفع حاجت کے بہانے بیت الخلاء میں گئے اور پستول بھر کر کمرے میں واپس آگئے"

لیکن حالات نے انھیں بتایا کہ یہ ان لوگوں کا محض ایک وہم تھا اور جیسا کہ احمد علی خان نے بتایا انھیں واپس بلانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت امان اللہ کا حکم پہنچا تھا کہ مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ساتھی بامیان کے راستے سفر نہ کریں۔ ان کے لئے وہ راستہ تجویز کیا گیا ہے جو سمت شمالی سے گذرتا ہے۔

یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا تھا کہ پہلا راستہ قطغن بدخشاں کے صوبے کے قریب سے گذرتا تھا۔ جہاں اس زمانے میں سپہ سالار جنرل محمد نادر خان بطور گورنر کام کر رہے تھے جنرل نادر خان مولانا سندھی مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ظفر حسن سے بھی محبت سے پیش آتے تھے انہوں نے جب سنا تھا کہ مولانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کابل سے جانے والے ہیں تو انھوں نے روکنے کی یا کم از کم ان کے آنے تک ٹھہرنے کی اطلاع بھیجی تھی لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ مولانا کابل میں مزید قیام نہیں کر سکتے تو انھوں نے درخواست کی تھی کہ وہ راستے میں روس جاتے ہوئے ان سے ملاقات ضرور کریں۔ اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کو سپہ سالار نادر خان سے مولانا سندھی کے تعلقات کا علم تھا غالباً انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ سپہ سالار نے مولانا سے ان کے کابل پہنچنے تک ٹھہرنے کی یا راستے میں ان سے ملتے ہوئے جانے کی درخواست کی تھی۔ اعلیٰ حضرت یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مولانا سپہ سالار نادر خان سے ملیں۔ انھیں خیال تھا کہ ممکن ہے سپہ سالار ان سے مولانا کو کابل میں ٹھہرے رہنے کی سفارش کریں ... ان کے لئے ایک مشکل صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اس امکان سے بچنے کے لئے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کے سفر کا راستہ بدل دیا جائے۔

جبل السراج میں علی احمد خان کی دعوت سے فارغ ہوتے ہی قافلہ پھر روانہ ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کے اس حکم کے بعد اب دوسرا اور دشوار گذار راستہ اختیار کرنے پر یہ قافلہ مجبور تھا۔ قافلے کے راستے کی نگرانی کرنے کے لئے چند افغان فوجیوں کو ساتھ کر دیا گیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میدانی علاقے میں سفر کرنے کے بعد پہاڑی سلسلے شروع ہو گئے۔ یہاں چونکہ ضلع سمت شمالی کی حد ختم ہو جاتی تھی اس لئے افغان فوجی یہاں سے واپس چلے گئے۔ یہاں سے راستہ بہت تنگ، دشوار اور سنگلاخ تھا اور نہایت دشوار چڑھائی شروع ہو جاتی تھی اس لئے مولانا مرحوم نے ظفر حسن کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ بار برداری کے ٹٹوؤں کو سلامتی کے ساتھ گزارنے کا بندوبست کریں ظفر حسن کو سمت جنوبی اور سمت مشرقی کے سفر میں پہاڑوں پر سفر کا تجربہ ہو چکا تھا اس لئے مولانا کی نظر میں وہ اس کام کے لئے سب سے موزوں شخص تھے۔ چنانچہ مولانا سندھی نے اپنے دیگر گھڑ سوار ساتھیوں کے ساتھ پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا اور ظفر حسن صاحب نے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش شروع کیا ظفر حسین صاحب لکھتے ہیں۔

میں نے بار برداری کے ٹٹوؤں کو اپنے اردلی اور قافلے کے سائیسوں کے ساتھ مل کر ایک ایک کر کے اور پیچھے سے ڈھکیل ڈھکیل کر بڑے بڑے پتھروں کے اوپر سے جو راستے میں پڑے ہوئے تھے گزار کر کوئی دو گھنٹے میں پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچایا۔ اس کے بعد اترائی شروع ہوئی جو چڑھائی سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوئی کیونکہ ٹٹوؤں کے پاؤں پھسلتے تھے اور ان کے لڑکھڑا کر گر جانے کا ڈر تھا۔ یہاں ایک ٹٹو دو آدمیوں کی مدد سے جس میں سے ایک اس کی باگ کو کوتاہ کر کے اس کا سر اوپر اٹھاتا تھا اور دوسرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دم پکڑ کر پیچھے کھینچتا تھا اور اس کو ٹھوکر کھانے اور گرنے سے روکتا تھا اس طرح آہستہ آہستہ تمام ٹٹوؤں اور خچروں کو پہاڑوں کی چوٹی سے میدان تک پہنچایا یہ اترائی تقریباً ایک گھنٹے جاری رہی۔"

یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک جھیل تھی جس کے کنارے مولانا مرحوم اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ظفر حسن کا انتظار کر رہے تھے تقریباً چار بجے وہ بھی مولانا سے جاملے۔ جھیل کے کنارے درختوں اور سبزے کی وجہ سے یہاں کا منظر نہایت پرکیف تھا لیکن دور دور تک آبادی نہ ہونے کی وجہ سے دلوں پر ایک وحشت طاری ہو رہی تھی۔ جھیل کا پانی صاف شفاف اور ٹھنڈا تھا۔ سب نے ہاتھ منہ دھوئے۔ ایک دو کے سوا سب نے نماز پڑھی۔ اسی دوران میں گھوڑوں اور ٹٹوؤں کو چارہ جو وغیرہ کھلائے تاکہ اگلی منزل کے لئے وہ پھر تازہ دم ہو جائیں تقریباً ایک گھنٹہ قیام کرنے کے بعد پھر سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ اس لئے کہ پڑاؤ کا گاؤں جہاں رات بسر کرنی تھی وہ سامنے کی پہاڑی جسے افغان کوتل دوشاخہ کہتے تھے، کے بعد کہیں واقع تھا۔

اب پھر پہاڑ کی پڑھائی شروع ہوئی۔ جو پچھلی پہاڑی پر چڑھائی سے بھی زیادہ مشکل تھی راستہ تنگ بھی تھا اور پتھریلا بھی۔ جس پر گھوڑوں اور ٹٹوؤں کے سم نہ جمتے تھے، پھسل پھسل جاتے تھے دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد اس کی چوٹی کے پاس پہنچے یہاں راستہ اور بھی تنگ ہو گیا تھا اور دو گھوڑے بھی برابر برابر نہ چل سکتے تھے۔ اس تنگ راستے کے ایک طرف پہاڑ کی سربفلک چوٹی ایک دیوار کی طرح کھڑی تھی اور دوسری طرف درختوں سے چھپا ہوا ایسا کھڈ تھا جس کی گہرائی کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ چوٹی کے بالکل قریب ایک خطرناک موڑ تھی جہاں سے راستہ اور بھی تنگ اور خطرناک ہو گیا تھا اور ایک گھوڑے کا گزرنا بھی دشوار تھا گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ایک ایک ساتھی اس خطرناک موڑ سے گزرا جب مولانا مرحوم کا گھوڑا آگے بڑھا تو اس کا پچھلا پاؤں پھسل گیا اور گھوڑا لڑکھڑانے لگا۔ مولانا نے بڑی مشکل سے اپنا توازن قائم رکھا خدا کے فضل سے گھوڑا اور مولانا دونوں سنبھل گئے اور خیریت کے ساتھ اس مقام سے گذر گئے اگر یہاں خدانخواستہ مولانا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجاتا تو ان کی کوئی مدد بھی نہ کی جاسکتی تھی اور مولانا کی نعش کا پتا بھی نہ چلتا۔ مولانا کے بعد ظفر حسن کی باری تھی اور خدا کے فضل سے وہ بھی خیریت سے اس خطرناک موڑ سے گزر کر اپنے ساتھیوں سے اور مولانا سے آملے۔ ان کے پیچھے بار برداری کے ٹٹو تھے۔ چند لمحوں کے بعد ایک ملازم نے آکر اطلاع دی کہ جس ٹٹو پر ظفر حسن کا سامان لدا ہوا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کا پیر پھسل گیا اور سنبھل نہ سکنے کی وجہ سے مع سامان کے ساتھ کھڈ میں جا گرا ہے۔ ظفر حسن صاحب کو اس خبر سے قدرتی طور پر سخت پریشانی ہوئی وہ ملازم کے ساتھ پیدل پھر اس دشوار گذار مقام سے واپس ہوئے اور ملازموں اور سائیسوں کو نیچے کھڈ میں اتارا۔ انھوں نے دیکھا کہ ٹٹو ایک درخت میں اٹک کر مر چکا ہے اور سامان اس کی پیٹھ پر بندھا ہوا ہے بہ مشکل تمام سامان کو ٹٹو کی پیٹھ سے کھولا اور رسیوں کے ذریعے سے پہاڑ کی چوٹی تک کھینچ کھینچ کر پہنچایا اس طرح سامان تو ضائع ہونے سے بچ گیا لیکن ایک ٹٹو مر جانے کی وجہ سے وہ سامان دوسرے ٹٹو پر لادا گیا اور اس کے مالک کو پیدل چلنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس چڑھائی کے بعد اترائی کا مرحلہ باقی تھا اور سخت خطرناک اور دشوار گذار تھا لیکن سب لوگ ایک دوسرے کے پیچھے احتیاط کے ساتھ گھوڑوں کی باگوں کو کھینچتے انھیں گرنے سے بچاتے ہوئے آہستہ آہستہ شام کے قریب پہاڑ کے دامن تک پہنچ گئے۔ اب شام ہو رہی تھی، اندھیرا دم بدم بڑھ رہا تھا اس گاؤں کا پتا نشان نہ تھا جہاں رات کو پڑاؤ کرنا تھا۔ اس لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ آگے بڑھتے رہیں اور ہمت نہ ہاریں۔ لیکن جو راستہ سامنے تھا وہ میدان اور ہموار نہ تھا بلکہ نہایت ناہموار تھا۔ چاروں طرف ایک پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن کے درمیان میں ایک ندی بہہ رہی تھی اور اس کے کنارے کنارے ایک تنگ راستہ تھا جس پر یہ قافلہ آگے بڑھ رہا تھا۔ چونکہ اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا اس لئے گھوڑوں کے لئے چلنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا قدم قدم پر لڑکھڑاتے تھے اور سواروں کے گرنے کا خطرہ تھا۔ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ برجی کے گھوڑے کو ایک جگہ ایسی ٹھوکر لگی کہ برجی گرتے گرتے بچے اور قریب تھا کہ وہ رونے لگتے ڈاکٹر نور محمد نے ان سے کہا کہ وہ گھوڑے سے اتر کر پیدل چلیں برجی نے جواب دیا "ارے اترنے کی جگہ کہاں ہے ہم کیسے اترے" برجی چونکہ بنگالی تھے اور اردو بہت ٹوٹی پھوٹی جانتے تھے اس لئے ان کا یہ جملہ مدت تک ساتھیوں کی تفریح طبع کا باعث بنا رہا۔

غرضیکہ اس دشوار گذار رستے پر اندھیرے میں تقریباً ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ایک مقام پر ندی کے دوسری طرف انھیں روشنی نظر آئی۔ مولانا سندھی مرحوم نے ڈاکٹر نور محمد اور ظفر حسن صاحب کو بھیجا کہ وہ اس طرف کو جائیں اور معلوم کریں کہ پڑاؤ کا گاؤں یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے مولانا کے یہ دونوں جاں نثار ساتھی بڑی مشکل سے وہاں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ یہاں کچھ افغان سپاہی ٹھہرے ہوئے ہیں جو سڑک بنانے کے لئے یہاں بھیجے گئے تھے۔ ڈاکٹر نور محمد اور ظفر حسن صاحب نے ان سے اپنا تعارف اان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عہدوں کے ذریعے سے کرایا جو افغان حکومت نے انھیں اعزازی طور پر دیئے تھے یعنی ڈاکٹر نور محمد بریگیڈیر تھے اور ظفر حسن صاحب کرنل تھے اس طرح تعارف کرانے کا ان سپاہیوں پر اچھا اثر پڑا۔ وہ بڑی خاطر تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ انھیں یہ خیال ہؤا کہ ان کے دستے کی چیکنگ کے لئے یہ افسر آئے ہیں۔ ڈاکٹر نور محمد نے ان سے اگلے پڑاؤ کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ایک گھنٹے کی مسافت پر گاؤں ہے جہاں پڑاؤ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں حضرت قافلے میں واپس آئے اور قافلہ آگے کو روانہ ہوا۔ آخر کار قافلہ اس گاؤں پہنچ گیا لیکن یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ عزیز احمد اور عمر ظفر مسعود غائب ہیں۔ اس گاؤں میں ان کی تلاشی کی گئی لیکن وہ گاؤں میں بھی نہیں تھے۔ مولانا مرحوم کو ان کی گمشدگی سے سخت پریشانی ہوئی خصوصاً عزیز احمد صاحب جو ان کے عزیز تھے اور اپنی سعادت مندی اور خدمت گزاری اور جاں نثاری کی بناء پر بھی مولانا کو بہت عزیز تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ انھیں تلاش کہاں کیا جائے؟ پیچھے واپس ہوا جائے یا آگے جا کر انھیں تلاش کیا جائے لیکن معلوم ہؤا کہ وہ قافلے میں پیچھے نہیں تھے اگر پیچھے ہوتے تو باربرداری کے نوکروں اور قافلے کے سائیسوں کو ضرور ملتے اس لئے اغلب خیال یہ تھا کہ وہ قافلے سے آگے نکل گئے ہیں لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ آگے جا کر انھیں تلاش کون کرے؟ ظفر حسن صاحب مولانا سے عقیدت اور نیازمندی کی وجہ سے امتیاز رکھتے تھے۔ مولانا نے انھیں اس زحمت کے لئے کہا اور وہ نہایت خوشی اور عزم کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر اگلے گاؤں کو روانہ ہوئے یہ گاؤں قریب تھا۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں وہاں پہنچ گئے اور تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں گمشدہ ساتھی ایک مکان میں بیٹھے قافلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اندھیرے میں انھیں پتہ نہ چلا اور وہ یہاں پہنچ گئے۔ قافلہ چونکہ پچھلے گاؤں میں پڑاؤ کر چکا تھا اس لئے ظفر حسن صاحب ان دونوں صاحبوں کو لے کر واپس آئے۔ انھیں دیکھ کر مولانا کی پریشانی دور ہوئی اور اللہ کا شکر ادا کیا کھانے کے لئے بہت ہی معمولی قسم کی غذا میسر آئی لیکن جو کچھ ملا اس پر اکتفا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

کوتل دو شاخہ سے اترنے کے بعد افغان ترکستان کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ افغان حکومت نے تمام راستوں پر ہر پندرہ بیس کوس کے فاصلے پر سرائے بنا رکھیں ہیں جہاں مسافر قیام کرتے ہیں۔ یہ تمام سرائیں ایک ہی وضع کی بنی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد سے مولانا نے یہ انتظام کیا تھا کہ ایک نوکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو قافلے سے آگے بھیج دیتے تھے جو افغان پر سرائے میں ان کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا انتظام کر رکھتا تھا۔ یہاں سے اکثر و بیشتر میدانی علاقہ تھا۔ اس لئے وہ مشکلات پیش نہ آئیں جو اس سے پہلے پیش آچکی تھیں دوسرے روز سفر میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ قافلے نے ایک گاؤں جس کا نام ایبک تھا رات بسر کی۔

اس طرح یہ قافلہ دن کو سفر کرتا اور رات کو سرائے میں قیام کرتا سات دن کے بعد ۲۲ر اکتوبر کو مزار شریف پہنچا۔ خوشی محمد نے یہاں روسی قونصل سے ملاقات کی۔ اسے مولانا کے کابل سے نکلنے اخراج اور قافلے کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی اور یہ ہدایت بھی مل چکی تھی کہ یہ لوگ ماسکو جا رہے ہیں انھیں ہر ممکن سہولت دی جائے۔ روسی قونصل سے ملاقات کے بعد خوشی محمد کا مزاج ہی بدل گیا اس کا رویہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے نہایت حقارت آمیز ہوگیا اور بخارا پہنچ کر تو مولانا سندھی مرحوم سے بھی نہایت گستاخانہ رویہ اختیار کیا۔

۲۳ر اکتوبر کو یہ قافلہ مزار شریف سے روانہ ہوکر دریائے آموں کے کنارے پہنچا قافلے کا خیال تھا کہ دریا کو عبور کرکے پٹاکیسر پہنچ جائیں گے جو روسی علاقے میں شہر ہے اور وہاں سے ریل کے ذریعے بخارا اور تاشقند کے لئے روانہ ہوجائیں گے لیکن دریا کے کنارے پہنچ کر معلوم ہوا کہ پٹاکیسر میں ریل نہیں ہے۔ کیونکہ باصماچیوں نے جو روسی انقلاب پسندوں کے خلاف تھے اور جن پر روسی حکومت اس وقت تک قابو نہ پا سکی تھی ریل کی پٹڑی اکھاڑ ڈالی ہے ملک میں انھوں نے لوٹ مچا رکھی ہے اور ان کی وجہ سے دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ راستے غیر محفوظ اور سفر پر خطر بنے ہوئے ہیں۔ مولانا کو بتایا گیا کہ ریل کرشی (یا کرکی) سے مل سکے گی جو یہاں سے تین چار روز کی مسافت پر ہے۔ اور خشکی کا راستہ چونکہ باصماچیوں کی وجہ سے غیر محفوظ ہے اور اگرچہ کشتی کے ذریعہ دریا کا سفر بھی پوری طرح محفوظ نہیں ہے لیکن اس سے زیادہ محفوظ راستہ بھی کوئی نہیں۔ اس لئے چار و ناچار کشتی کے ذریعے سفر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

یہاں چونکہ افغانستان کی حد ختم ہوجاتی تھی اور آگے سفر بھی کشتی کے ذریعے اور پھر ریل کے ذریعے کرنا تھا اس لئے کابل سے جو گھوڑوں کے مالک اور باربرداری کے لئے جو ملازم آئے تھے ان کے کرایوں اور اجرتوں کا حساب کرکے انھیں روانہ کر دیا گیا۔ جب کشتی آئی تو دریا کو عبور کرکے دوسری جانب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچے۔

یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کشتی دوسرے کنارے پہنچی تو معلوم ہوا کہ ساحل بنا ہوا نہیں ہے نہ کشتی بالکل کنارے پر پہنچ سکتی ہے کہ سواریاں کشتی سے خشکی پر کود سکیں کشتی کو کنارے سے کچھ فاصلے پر دریا میں ٹھہرنا پڑا جب لوگ اترنے کے لئے اپنے بوٹ وغیرہ اتارنے لگے تو کشتی والوں نے کہا کہ بوٹ وغیرہ اتارنے کی ضرورت نہیں ہے وہ سب کو پیٹھ پر لاد لاد کر کنارے پر پہنچا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کشتی والوں نے سب کو پیٹھ پر لاد لاد کر کنارے پر پہنچایا۔ یہ ایک عجیب مضحکہ خیز صورت تھی اور سب لوگ ایک دوسرے کی ہیئت کذائی پر ہنس رہے تھے۔ لیکن چونکہ مولانا سندھی ساتھ تھے اس لئے ضبط بھی کرتے تھے۔ لیکن ڈاک کے ایک روسی ہرکارے کی باری آئی جس کی ٹانگ میں چوٹ بھی لگی ہوئی تھی اور وہ تکلیف سے لنگڑا کر چل رہا تھا تو اس نے کشتی والے کی پیٹھ پر سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ اور کہا اسے یہ بات انسانی شرف کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ ایک انسان دوسرے کی پیٹھ پر سوار ہو۔ وہ پانی میں اترا اور اسی تکلیف کی حالت میں اپنے پیروں سے کنارے پر پہنچا۔ اس کے اس کردار سے سبھی لوگ متاثر ہوئے لیکن مولانا مرحوم پر اس واقعے کا بہت اثر ہوا انھوں نے بار بار اس کے خیالات اور کردار کو سراہا۔

اب یہ قافلہ روسی سرحد میں داخل ہو چکا تھا۔ پٹاکیسر جس کا تاریخی نام ترمذ تھا یہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ ترمذ وہی مقام ہے جہاں کے ایک مشہور محدث محمد بن عیسیٰ ترمذی گزرے ہیں جن کی حدیث کی کتاب "جامع" صحاح ستہ (حدیث کی چھ صحیح ترین کتابوں) میں شامل ہے۔ مولانا سندھی اور دوسرے ساتھی کنارے پر سامان کے پاس ٹھہرے اور خوشی محمد اور ظفر حسن کو ترمذ بھیجا گیا کہ وہ وہاں کے حاکم سے مل کر ان کے لئے سواری اور شہر میں ٹھہرنے کا بندوبست کریں اقبال شیدائی صاحب لکھتے ہیں:

"روسی حاکم ان سے بڑی سرد مہری سے پیش آیا۔ اس نے ایک ہندوستانی سپاہی کو ان کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ گاڑی لے کر ان کا سامان وغیرہ لے آئے روسی حاکم کے رویے کے باعث محمد علی (خوشی محمد) کا درجۂ حرارت معمول پر آچکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ روسی انھیں ہندوستانی کمیونسٹ لیڈر سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن روسی حاکم کا رویہ بڑا محتاط تھا۔ ہندوستانی سپاہی جس کا نام محمد خان تھا۔ ہمیں ایک مکان میں لے گیا اور ایک بڑا کمرہ دکھاتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اس میں رہ سکتے ہیں۔"

دوسرے روز اسی ہندوستانی سپاہی نے کرایہ پر ایک کشتی کا انتظام کردیا جس میں یہ قافلہ سوار ہوکر کرکی کی طرف روانہ ہوگیا۔ کشتی چونکہ دریا کے بہاؤ پر چل رہی تھی اس لئے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اگر کبھی ضرورت پڑتی تو ملاحوں کے ساتھ قافلے والوں میں سے چپو چلانے لگتا تھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر سینکڑوں میل تک بہت گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں باصاحبیوں سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ کہ وہ کسی وقت بھی جنگل سے نکل کر کشتی پر حملہ آور ہوں۔ اس لئے کشتی کو بیچ دریا میں چلانے کی کوشش کی جاتی تھی اور رات کو کنارے سے دور کسی تنہائی کے مقام پر لنگر انداز ہوتی تھی۔

(مسلسل)

© rasailojaraid.com